JOURNAL OF RESEARCH (URDU)

ISSN (Print): 1726-9067, ISSN (Online):1816-3424
Volume No. 39, Issue No.02

TITLE OF THE PAPER

جدید اُردو غزل میں مقامی الفاظ اور ثقافتوں کی جلوہ گری

AUTHOR(S)

*Dr. Tariq Hashmi
Associate Professor, Department of Urdu, G.C. University, Faisalabad

**Khurram Shehzad Khurram
Lecturer, Dept. of Urdu,Govt. Graduate College of Science, Faisalabad

***Syeda Fasiha Abid
PhD Scholar, Department of Urdu, G.C. University, Faisalabad

CONTACT
tariqhashmi70@gmail.com

HISTORY OF THE PAPER

Received on: 22-11-2023
Accepted on: 28-12-2023
Published on: 31-12-2023

DETAIL(S)

Volume No. 39, Issue No. 02, Page No: 174-195
Publisher:
Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University
Multan (Pakistan)-60800

LICENSE

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

COPYRIGHT

©The author(s) 2023. ©Journal of Research (Urdu) 2023.
This publication is an open access article.

JOURNAL'S PROFILE

Journal of Research (Urdu) is a bi-annual "Y" category journal approved by Higher Education Commission of Pakistan.
It started in 2001 from Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan). At that time, it was owned by the Faculty of Languages & Islamic Studies. Later in 2008, Higher Education Commission of Pakistan recognized it as a research journal of Urdu in Category "Z". Since then, it is owned by the Department of Urdu, BZU, Multan. In 2014, it was upgraded and accepted for Category "Y".

CONTACT

Dr. Muhammad Khawar Nawazish
Editor, Journal of Research
Department of Urdu, BZU Multan-60800

MOBILE:
+92 300 9561745

WEBSITE:
https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

EMAIL:
jorurdu@bzu.edu.pk
khawarnawazish@bzu.edu.pk

ADDRESS

Office of the Journal of Research (Urdu), Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 39, Issue No. 2, December 2023

*ڈاکٹر طارق ہاشمی، **خرم شہزاد خرم، ***سیدہ فصیحہ عابد

جدید اُردو غزل میں مقامی الفاظ اور ثقافتوں کی جلوہ گری

Reflection of Native Words and Cultures in Modern Urdu Ghazal

ABSTRACT

Ghazal is primarily related to the mainland Persian, but after being introduced in India, it was expressed in a language that is a common heritage of the local civilizations here. The current form of this language has many historical factors and their linguistic effects, and on their basis, its linguistic structure looks slightly different from some other languages here, but if its ancient literary heritage is seen, the facts are seen. It looks very different. These facts show that the language has been minimal in other languages of the subcontinent, but in some cases it does not exist. Ghazal has been the backbone of our civilization, but in relation to civilization, our concept has come out of the Arabs and the Arabs, and it is seen on a limited scale of local cultures. In Urdu lyrics, the style and paradigm of the beautiful efforts that the poet has made to combine local words and culture proves that the minimum and creative links in Urdu and local languages are very high, but these walls are demolished. It could not be done in the past and was raised under a particular concept of civilization.

KEYWORDS

Ghazal, Persian, Urdu, Punjabi, Pashto. Balochi, Locality, Culture

غزل کا بنیادی تعلق سرزمین فارس سے ہے لیکن ہندوستان میں متعارف ہونے کے بعد اس کا شعری اظہار اس زبان میں ہوا جو یہاں کی مقامی تہذیبوں کا مشترکہ ورثہ ہے۔اس زبان کی موجودہ شکل میں بہت سے تاریخی عوامل اور ان کے لسانی اثرات کارفرما ہیں اور ان کی بنیاد پہ اس کا لسانی ڈھانچہ یہاں کی بعض دیگر زبانوں سے قدرے مختلف بھی دکھائی دیتا ہے لیکن اگر اس کے قدیم ادبی ورثے کو دیکھا جائے تو حقائق بہت مختلف دکھائی دیتے ہیں۔یہ حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ اس زبان کا برصغیر کی دیگر زبانوں سے لسانی بُعد کم سے کم رہا ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو موجود ہی نہیں۔"اردو کے خوابیدہ الفاظ" کے عنوان سے مرتبہ لغت میں جن الفاظ کا ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے اس کی روشنی میں دیباچہ نگار کا یہ اعتراف دلچسپ ہے کہ:

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 39, Issue No. 2, December 2023

"ایک روز لغت میں کسی لفظ کے معنی تلاش کرتے ہوئے اردو زبان میں چند ایسے الفاظ نظر آئے جو اردو تحریر و تقریر میں تو کم استعمال ہوتے ہیں لیکن پاکستان کی علاقائی زبانوں میں اظہار کا اہم حصہ ہیں۔ ان الفاظ نے خدا جانے کب اور کس وجہ سے اپنی حرکی قوت ہوتی کہ انہیں لغت کہ انہیں لغت کے اوراق میں روپوش ہونا پڑا اور ان کی روپوشی کے بعد کوئی انہیں اپنے بیان کی داستان سرائے میں واپس بھی نہ لا سکا یہ الفاظ خوابیدہ ضرور ہیں متروک نہیں۔"(1)

مذکورہ الفاظ کی خوابیدگی کے اسباب متفرق ہیں۔ عربوں اور وسط ایشیائی اقوام اور اہل فارس کی حکمرانی اور بعض تہذیبی مقاصد کے حصول کے لیے آرزو کی بنیاد پر اردو زبان کا لسانی ڈھانچہ تبدیل ہوتا گیا۔ اس طرح اصلاحِ زبان کی بعض کوششوں سے بھی اس زبان کے تخلیق کاروں نے بعض بدیسی زبانوں سے انس جبکہ مقامی زبانوں سے قدرے اجنبیت محسوس کرنا شروع کر دیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی قدیم تصنیفات میں مقامی لسانی تعلقات بہت تاباں نظر آتے ہیں۔ اردو کی قدیم تصنیفات کا لسانی جائزہ لیا جائے تو بے شمار الفاظ ایسے مستعمل اور متحرک نظر آتے ہیں جو برصغیر کی محض مقامی زبانوں کا ورثہ خیال کیے جاتے ہیں۔ "قدیم اردو کی لغت" مرتب کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ :

"اس لغت میں ہزاروں الفاظ ایسے ملیں گے جو پاکستان کی علاقائی زبانوں میں آج بھی زندہ اور مستعمل ہیں اور یقیناً ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں کہ الفاظ کو دوبارہ اپنی تحریروں میں استعمال کر کے اردو کو علاقائی زبانوں سے اور علاقائی زبانوں کو اردو سے قریب تر لایا جائے۔"(2)

یہی وہ اعتراف ہے جو ڈاکٹر ریاض قدیر نے بھی پنجابی زبان کے حوالے سے تقریر اور پنجابی کے لسانی روابط پر تحقیق کے نتائج پیش کرتے ہوئے کیا ہے۔ ان کے مطابق :

"دونوں علاقوں کی زبانوں میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہیں۔ مشترک الفاظ کی ایک کثیر تعداد دونوں زبانوں کی لسانی قربتوں کا پتہ دیتی ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ

محض لغوی اشتراکات کو دو زبانوں کے باہمی ربط و تعلق کا بنیادی معیار قرار نہیں دیا جا سکتا، جب تک اس کی تصدیق دونوں زبانوں کے قواعد صرف و نحو سے نہ ہو جائے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو دونوں زبانوں کے قواعد صرف و نحو میں بھی گہری مماثلت موجود ہیں۔"(3)

مذکورہ لسانی حقائق کے اظہار کا مقصد یہ نکتہ واضح کرنا ہے کہ اردو اور پاکستان کی علاقائی زبانوں میں غیریت کبھی نہیں رہی تھی بلکہ بعض تاریخی واقعات یا بعض مخصوص مقتدر طبقات کے سماجی مقاصد کی وجہ سے دوریاں پیدا ہوئی۔ فی زمانہ جب شعری ادب کی قدیم چشموں سے دوبارہ سیرابی کی آرزو تخلیقی سطح پر کرتے ہیں تو انہیں دلچسپ تو قرار دیا جاتا ہے لیکن ان کی ایسی پذیرائی کم ہوتی ہے جس سے ان کی کاوشوں کو تسلسل یا قبول عام کی سند نصیب ہو سکے۔ دکنی غزل کے قدیم سرمائے میں زبان کی لسانی ساخت اور ذخیرہ الفاظ دیکھے جائیں تو اس کے خد و خال پاکستان کی مقامی زبانوں سے کمال حد تک مماثل ہیں:

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک تل جیا جائے نا
نہیں عشق جس وو بڑا کوڑ ہے
کدھیں اس سے مل جیا جائے نا
(قلی قطب شاہ)

"باج"، "کوڑ" اور "کدھیں" ایسے الفاظ اب اردو میں مستعمل نہیں رہے لیکن پاکستان کی بیشتر مقامی زبانوں میں زندہ اور متحرک ہیں۔ اردو غزل میں اس نوع کے الفاظ نیز بعض قواعدِ زبان کا اظہار میر کے ہاں فراواں نظر آتا ہے۔ انھوں نے مقامی اثرات کے تحت عربی اور فارسی اسما کے آخر میں ی لگا کر اسم فاعل اور اسمِ صفت بنائے ہیں:

جو کوئی تلاشی ہو ترا آہ کدھر جائے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے

اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

میرؔ و سوداؔ کے دور میں پشتو ثقافت کے زیر اثر اردو غزل میں بعض لسانی کوششیں غزل کے لحن کو ایک نئے آہنگ سے متعارف کراتی ہیں۔اس حوالہ سے ایک بڑااہم نام قاسم علی خان آفریدی کا ہے۔ جنھوں نے نہ صرف اردو غزل میں پشتوالفاظ کااستعمال کیابلکہ زبان وبیان کی سطح پر پشتون لہجہ بھی اختیار کیا:

زطرفِ غیر غمازی کواُس کے کان تک شاید
کوئی ریبار جا پہنچا بنا پوچھے خبر ہم سے

دنیا سے کود جانا کیا سخت آفریدی
جو این و آں سے کودے غرزنگ ہے سو یہ ہے

اُس ماہ رو کی دید کو لے شام صبح تک
رکھتا ہے واز چشم کو کو کب تمام شب

مذکورہ اشعار میں قاصد کے لیے "ریبار" جست کے لیے "غرزنگ" اور باز کے لیے "واز" ایسے پشتو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ قاسم علی خان آفریدی نے پشتو کی رعایت سے بعض الفاظ کی تذکیر وتانیث میں بھی لچک پیدا کی ہے۔ مثلاًانھوں نے داستان، جفا، خطا،اور بہار کے الفاظ کو مذکر باندھا ہے۔اس طرح اُن کے ہاں بعض الفاظ کا تلفظ بھی قابل لحاظ ہے:

جس طرح موت، قیامت ہے، حشر تینوں ایک
شکم مادر و تہ خانہ قبر تینوں ایک

دیوانِ قاسم علی خان آفریدی کے مرتب نے حاشیے میں لکھا ہے کہ:

"ان الفاظ کا تلفظ شایداُس وقت پشتو(یاپنجابی) کے مطابق تھا۔"(4)

تاہم آفریدی جس دور سے تعلق رکھتے ہیں، کسی دوسرے اردو شاعر کے ہاں تلفظ کی اس نوعیت کی مثالیں نہیں ملتیں۔

قیام پاکستان کے بعد ان کی ایک نئی جہت بھی سامنے آتی ہے۔اس سلسلے میں جہاں ناصر کاظمی اور منیرؔ نیازی نے خالص اردو میں شعر کہنے کے رجحان کو فروغ دیا وہاں بعض شعرا نے غزل کی لسانیات اور اسلوب کو پاکستان کی لوک ثقافتوں سے ہم آہنگ کرنے کے تجربات بھی کیے اور یہاں کی علاقائی زبانوں اور ان سے وابستہ ثقافتوں کے خنک چشموں سے تاباں موتیوں کی جستجو کی۔

جستجو کے اس سفر میں اردو غزل کے دو راہرووں شیر افضل جعفری کی کلّی اور صوفی تبسّم کی جزوی کوششیں تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔شیر افضل جعفری کا تعلق پاکستان کے ضلع جھنگ سے تھا جو بالائی اور زیریں پنجاب کا نقطۂ اتصال اور چناب کنارے آباد ہے۔اس شہر میں بولی جانے والی بولی "لہندا" پنجابی اور سرائیکی کے ملاپ سے جنم لیتی ہے۔شیر افضل جعفری نے اردو اور اپنی مقامی بولی کے الفاظ کی غیریت ختم کرنے کے سلسلے میں غزل میں متنوع لسانی تجربات کیے ہیں۔جس سے "زبان کو ابلاغ کی ایک نئی اور نرالی صلاحیت ملی ہے اور بیان ایک ایسی تاثیر سے دوچار ہوا ہے جو اس سے قبل بہت کم سخن وروں کے حصے میں آئی ہے۔"(5)

سوئے سیج سہاگ پہ کملی
تڑپے ساری رات سیانی

غزل کے ورد سے اور ماہیے کے چلے سے
کیا ہے کیکروں کو جھنگ میں "سرو" میں نے
تڑا کے لہندے کے لہجے کے لال لال گلاب
کیا ہے سانولی اردو کو سرخ رو میں نے

بھارت میں دلّی، بنارس، اودھ اور بریلی اپنی مخصوص ثقافتوں کی بدولت بہت معروف ہیں لیکن شیر افضل جعفری نے جھنگ کے تمدن کو ان شہروں کے مقابل پیش کیا ہے:

سجا کے ہیر کے گاؤں کو نورو نغمہ سے
بنا دیا ہے بنارس کا بھی گرو میں نے

اس طرح موج میں آ جھنگ بریلی ہو جائے
شاعری تیری شریعت کی سہیلی ہو جائے

غزل کی یہ روایت جس کے لیے "لوک غزل" کا عنوان مناسب ہے، اپنے اندر بہت سے امکانات رکھتی ہے۔ شیر افضل جعفری کے اشعار ایک نئے تمدّنی محاورے اور ثقافتی ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں اور اُن کے مجموعۂ کلام پاکستانی معاشرے کی اردو کے لیے ایک جدید لغت ترتیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے علاقائی جغرافیے کی فضا کو اُس اجنبی تمدنی ورثے کی وساطت سے نہیں دیکھتے جو زبان و بیان کو لکھنوی اور دہلوی حد بندیوں میں محصور کر دیتا ہے۔

بادل کی ونجھلی میں نیندوں کی بھیرویں ہے
ٹھنڈی ہوا کے ہونٹوں پہ آج لوریاں ہیں
لیتی ہیں مے کدوں سے شرما کے باج افضل
وہ بولیاں کہ جن کی آنکھیں کٹوریاں ہیں

کوئی کھیون ہار نہیں ہے
بیری دریا پار نہیں ہے
ہر چڑھنے والے کے حق میں
سولی چنبہ ہار نہیں ہے

شیر افضل جعفری نے صرف لسانی تبدیلی کی کوششیں نہیں کی ہیں بلکہ غزل میں پنجاب کی پوری ثقافت کو گوندھا ہے۔ پنجاب کی مختلف ذاتیں: سیال، بلوچ، سید اور لالی، پنجاب کے ناچ: جھمر، دریس اور سمی اس طرح موسیقی کی وہ اصطلاحات یا آلات جو یہاں مروّج ہیں: سندھڑا، ملھار، ونجھلی، چنگ، کھماج، اکتارا اور تونبا۔ پنجاب کی فصلیں،

درخت، دریا نہریں حتیٰ کہ حیوانوں کے نام بھی غزل کا اس طرح حصہ بنائے گئے ہیں کہ ایک نیا تہذیبی منطقہ تشکیل پاتا ہوا نظر آتا ہے۔

اردو غزل میں یہ تجربہ نظیرا کبرآبادی کے تجربات کی توسیع ضرور ہے لیکن مختلف اس لحاظ سے ہے کہ نظم کا مزاج اتنا حسّاس نہیں ہے جتنا کہ غزل کا ہے۔ نظم ہر نوع کا لفظ اور لہجہ قبول کرتی ہے، غزل بھی رد نہیں کرتی لیکن تخلیق کار سے ایک گہری ریاضت کے تقاضے کے بعد قبولیت کے دروازے کھولتی ہے۔ شیر افضل جعفری کے ہاں وہ ریاضت نظر آتی ہے جس سے غزل کا باب قبولیت وا ہوتا ہے۔

لسانی اور ثقافتی تجربات کے علاوہ شیر افضل جعفری کی غزل میں شعری تجربے اور مذہبی تجربے کا ملاپ بھی اُن کے اسلوب کو انفرادیت آشنا کرتا ہے۔ اردو غزل کے کلاسیکی مزاج میں اگرچہ تصوف اور عرفان کا رچاؤ ہمیشہ سے رہا ہے لیکن جعفری کی غزل میں روحانی تجربہ تصوف کے وحدت الوجودی یا وحدت الشہودی افکار سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسے مست الست فقیر کے جذبات سے ہم آہنگ ہے جو ہمارے ماحول میں مذہب کی مروّج روایات اور اقدار کی پاسداری میں ایک قلبی سکون محسوس کرتا ہے۔ نماز، تہجّد، تلاوت قرآن، تراویح، شبِ معراج اور لیلۃالقدر میں عبادت اور احاطۂ مسجد میں قیام کی لذّت و سرشاری جعفری کی غزل میں ایک بالکل مختلف ذائقہ کے اشعار کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔ اردو غزل میں اسلوب کا یہ زاویہ ایک نئے شعری لحن کی دریافت ہے:

مسجد ہے، خنک رات ہے، مٹی کا دیا ہے
اس مست فضا نے مجھے سرمست کیا ہے
مجھ سالک و درویش نے الہام کا نشہ
لیلائے شبِ قدر کی آنکھوں سے پیا ہے

اک رندِ الٰہی کو جو ارمان بہ لب ہے
قرآن کے رخسار کے بوسے کی طلب ہے
پھاگن ہے، خنک چاندنی ہے، سامنے رب ہے

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 39, Issue No. 2, December 2023

یہ رات غزل کے لیے معراج کی شب ہے

اردو غزل کو پنجاب رنگ سے ہم آہنگ کرنے کا دوسرا اہم تجربہ صوفی تبسّم کی وہ عروضی کوشش ہے جو انھوں نے ہیر وارث کی بحر کو غزل میں برتنے کے سلسلے میں کیا ہے۔اس جدّت طرازی کے سلسلے میں مالک رام نے ایک واقعہ تحریر کیا ہے:

"ہیر وارث شاہ پنجابی زبان کا شہرہ آفاق اور لازوال شاہ کار ہے۔ایک دن دوستوں کے حلقے میں یہ بات زیر بحث آگئی کہ وارث شاہ نے یہ نظم کس بحر میں لکھی ہے، خیر تھوڑی سی بحثا بحثی کے بعد یہ تو طے ہو گیا کہ کون سی متداول بحروں میں حذف واضافہ کر کے یہ نئی بحر ایجاد کی گئی ہے۔لیکن اب یہ بحث چھڑ گئی کہ کیا یہ بحر اردو میں بھی استعمال ہو سکتی ہے۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ممکن ہے۔دوسرے اس پر شبہے کا اظہار کر رہے تھے۔صوفی تبسّم ٹھہرے استاد کہنے لگے کہ اس میں ناممکن ہونے کی کیا بات ہے اور شعر کہا:

شبِ ہجر کی یاس انگیزیوں میں آئی اس طرح یادِ وصال تری
جیسے شمع قندیل میں ہو روشن، جیسے بادلوں میں مہ تاب چمکے

یہ بحر جیسی اوبڑ کھابڑ ہے، وہ ظاہر ہے۔غرض اس کے بعد انھوں نے باقاعدگی سے پنجابی بحر میں لکھنا شروع کیا۔"(6)

مذکورہ بحر پنجابی، ہندکو اور سرائیکی زبان میں منظوم قصوں، دوہوں اور حرفیوں میں استعمال کی گئی ہے اور ان مقامی بولیوں کا لہجہ اس بحر کے لحن سے ہم آہنگ بھی ہے۔اس لیے علاقائی شعرانے اس بحر کو برتتے ہوئے کوئی مشکل محسوس نہیں کی ہوگی۔لیکن اردو زبان کے لیے اس کھردری اور سنگلاخ بحر کے پتھریلے مد و جزر کا برداشت کرنا قدرے مشکل امر محسوس ہوتا ہے۔صوفی تبسم نے نہ صرف اس مشکل کو حل کیا ہے بلکہ پنجابی بحر کو برتتے ہوئے اُن کا موسیقی سے شغف اور دسترس بھی اپنا جوہر دکھاتی ہے:

کل وہ مست شباب نقاب الٹے محوِ سیر جو گل و گلزار میں تھی
ایک چمن گویا صحن چمن میں تھا ایک بہار گویا نو بہار میں تھی
اب شباب کے دِنوں کی بات کیسی اب وصال کی رات کا تذکرہ کیا
نہ وہ دن اپنے اختیار میں تھے نہ وہ رات اپنے اختیار میں تھی

پنجابی بحر کو اردو غزل میں برتنے کی یہ جدت یقیناً عروضی لحاظ سے تاریخ ساز ہے۔ صوفی تبسم سے پہلے کسی اور شاعر نے یہ تجربہ نہیں کیا بلکہ بعد میں بھی معدودے چند شعرا ہی اس بحر میں طبع آزمائی کر سکے ہیں۔ تاہم یہاں اردو غزل کے کلاسیکی دور میں بہادر شاہ ظفرؔ کی ایک غزل کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں، جس میں انھوں نے ایک ایسی بحر اختیار کی ہے جو پنجابی کی مذکورہ بحر سے زیادہ مختلف نہیں ہے:

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا
ظفرؔ آدمی اُس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

اردو غزل کو علاقائی الفاظ اور ثقافت سے ہم آہنگ کرنے کی ایک کوشش عبداللہ یزدانی کی بعض غزلیں بھی ہیں جن میں سرحد کی پشتون اور سرائیکی تہذیبوں کا رچاؤ نظر آتا ہے:

اب حسینوں سے بات کرنے کی
موکھ کہتے ہیں سو روپے ہو گی
پھول تو تب کھلیں گے یزدانی
جب چمن میں وہ گل مخے ہو گی

اسی طرح اُن کی غزل جس میں علاقائی ثقافت کا ذائقہ اپنی پوری مٹھاس کے ساتھ محسوس ہوتا ہے:

بھاگ والی ہے حور ڈھکی کی
کھا رہی ہے کھجور ڈھکی کی

بیٹھ کر یار کے کجاوے میں
کی ہے سرحد عبور ڈھکی کی
دل کو شاداب کر رہی ہیں بہت
خجیّاں بور بور ڈھکی کی

اردو غزل میں مقامی الفاظ اور تہذیب و ثقافت کی آمیزش کے سلسلے میں "رچنا" ایک منفرد ذائقہ، ہے جس میں علی اکبر عباس نے کچھ ایسی غزلیں کہی ہیں جن میں پنجاب کی دیہی ثقافت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یوں یہ تجربہ غزل مسلسل کے ساتھ ساتھ اسلوب اور زبان کے حوالے سے بھی لائق بحث ہے۔ ان غزلوں میں پنجاب کے دیہات کی فضااوراس سرزمین کی تہذیب وثقافت کی متنوع تمثالیں تراشی گئی ہیں جن میں کھیتوں کے مناظر بھی ہیں، موسموں کا تنوع بھی ہے، زندگی کے مختلف طبقے اور اُن کی طرز زندگی کا عکس بھی ہے اور مختلف مواقع، مقامات اور تہواروں میں اُن کے انداز واطوار کا ذکر بھی ہے:

دن چڑھا گلی آباد ہوئی، بُڑھیوں کی جمی چوپال بھلا
گودوں میں پوتے پوتیوں کی کبھی ناک بہے کبھی رال بھلا
کوئی چھاج چنگیر بنے بیٹھی یا رنگلی پنیوں کی پنکھی
کوئی چاول پھٹکے، صاف کرے کوئی چنے بیٹھ کے دال بھلا
کچھ دکھ سکھ پچھلے ویلے کے کچھ یادیں الھڑ عمروں کی
سب اگلی پچھلی نسلوں تک پھیلے باتوں کا جال بھلا

اپنی مٹی کے مظاہر اور اُس کی تصویریں جہاں موسموں اور فصلوں کی تمثالوں کے ذریعے کھینچی گئی ہیں وہاں ایک حوالہ عورت بھی ہے۔ "علی اکبر عباس کے ہاں زمین ایک عورت بلکہ ماں کے روپ میں اور اُس کے گھر کا آنگن آسمان تک پھیلا ہوا ہے۔"(7) یہی وجہ ہے کہ رچنا کی غزلیات کا غالب حصہ دیہاتی عورت اور اُس کی مختلف حیثیتوں کے حوالے سے اُس کے نسائی احساسات سے علاقہ رکھتا ہے۔ عورت کہیں ماں کی صورت میں بیٹی کے اچھے مستقبل

کے خواب دیکھتی ہوئی نظر آتی ہے تو کہیں بیٹی کے روپ میں ماں سے اُس لحن میں مخاطب ہوتی دکھائی دیتی ہے جو پنجاب کے شاعر صوفیوں کی کافیوں میں سنائی دیتا ہے:

کیا جانوں کہاں گراں میرا
کس گوٹھ مرا سنسار نی ماں
مرا دانہ پانی کن ہاتھوں
کن ہاتھوں میری مہارنی ماں
اب سائیں سنوارے لیکھ مرے
تو اپنا کاج سنوار نی ماں

"رچنا" میں پنجاب کا زندہ معاشرہ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور اس معاشرے کا ہر کردار جو کسی بھی طبقے سے متعلق ہے اپنی زندگی کی پوری توانائی کے ساتھ متحرک نظر آتا ہے۔ چودھری، نمبر دار، وکیل، نائی، مصلّی، سکول جاتے بچے اور گھر آنگن آباد کی ہوئی عورتیں ان غزلوں میں زندگی کی روح بھرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض قمری مہینوں میں اجتماعی مذہبی مصروفیات کی تصویر کشی بھی لائقِ داد ہے۔ ان غزلوں کا سارا حسن پنجاب کے ماحول اور اس کی مخصوص فضا کی جزئیات نگاری ہے۔

خوراک میں مستو سردائی پہنا وا ہلکے رنگوں کا
اور سارا دن رجبا ہے پر اک تانتا تنگ دھڑنگوں کا
پھوٹی جو شفق ہاتھوں میں تھے ہندوانے دو کاشے ہو کر
پھر دیکھا دیکھی باڑی میں در آیا میلہ سنگوں کا

"رچنا" کی غزلوں میں افسانوی اور ڈرامائی تاثر بھی قاری کی متوجہ کرتا ہے۔ یہاں پہلی غزل سے لے کر آخر تک ایک داستانوی تسلسل زیریں لہر کی صورت میں چلتا ہے۔ اردو غزل میں پاکستان کے علاقائی بولیوں کے الفاظ اور اُن کے ثقافتی عناصر کے اظہار کو شش اگرچہ نئی نہیں ہے تاہم رواں دہائی میں ان تجربات کی ایک تخلیقی توسیع ضرور دیکھنے میں آئی۔ اس سلسلے میں سب سے اہم اور مربوط تجربہ علی اکبر عباس کا مذکورہ سلسلۂ غزلیات "رچنا" ہے۔

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 39, Issue No. 2, December 2023

جس میں نہ صرف پنجاب کی ثقافت کی تصویر گری کی گئی ہے بلکہ مروجہ اردو زبان کی ایک نئی لسانی جرأت مندانہ کوشش کی گئی ہے کہ اس کے ناپسند کرنے والوں نے بھی اسے اردو شاعری کی تاریخ کا نہایت جرات مندانہ تجربہ قرار دیا ہے۔ پاکستانی غزل میں اس لسانی بے باکی کا پہلا اظہار تو شیر افضل جعفری نے کیا تاہم علی اکبر عباس کے ہاں اعتماد اور زبان کے تشکیلی عمل کی پختگی نقش اوّل کی نسبت زیادہ اور صاف ہے۔ علی اکبر عباس نے صرف پنجابی الفاظ کو برتنے کا تجربہ نہیں کیا ہے بلکہ دو زبانوں کے تال میل سے ایک نیا لہجہ تشکیل دینے کی کوشش کی ہے جس میں مصنوعی پن محسوس نہیں ہوتا البتہ اردو غزل کے لحن سے اس لہجے کی ہم آہنگی میں ابھی کچھ وقت درکار ہے۔

غزل میں اردو زبان کے برتاؤ کو مقامی لب و لہجے سے ہم آہنگ کرنے کا ایک اور عمدہ تجربہ جلیل عالی کے ہاں توسیع پذیر دکھائی دیتا ہے جو الفاظ کی ترکیب سازی کے سلسلے میں ہے۔ فکِ اضافت کا یہ تجربہ پہلی بار ظفر اقبال نے کیا تاہم اُن کے ہاں زبان کے ساتھ یہ رویہ مستقل حیثیت نہیں اختیار کر سکا اور اس تجربہ کا صحیح امکان جلیل عالی کی غزل میں نظر آتا ہے:

اب کی بہاروں جو بن پر تھے شوق شجر کتنے
کس کو خبر تھی آ جائیں گے درد ثمر کتنے
گزرے کیسے کیسے ظالم لمحوں کی لشکر
کھودی یاد زمین تو نکلے خواب کھنڈر کتنے

فارسی ترکیب سازی سے گریز کے اس عمل نے بیان میں یہ سہولت پیدا کی ہے کہ اب زبانوں کے میل جول کے دوران میں اُن زبانوں کے الفاظ جو آپس میں آہنگ کی اجنبیت کے باعث باہم نہیں جوڑے جا سکتے تھے اب بڑی آسانی سے ترکیب کے پیکر میں ڈھالے جا سکتے ہیں۔ سوچ سفر، خیال پنچھی، ملن ساحل، خواب کھنڈر اور شوق تتلی کی تراکیب میں تجربے کا امکان بھرپور اور روشن ہے۔ معترضین کے نزدیک اگرچہ اس تجربے سے غزل ٹیلی گرافی زبان سے قریب آتی نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سہولت بہت فطری اور مستقبل کے لیے خوش آئند ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اس تجربے کے حوالے سے بہت عمدہ بات کی ہے کہ "ہمارے بعض ذہین نوجوان اگر اظہار

میں جلیل عالی کے سے اجتہادات برتنے کا حوصلہ کر لیتے تو انھیں نثری نظم کے زیر زمیں غاروں میں پناہ لینے کے لیے نہ اتر ناپڑتا۔"(8)

اڑا دیے رنگ تتلیوں کے گمان شیشوں اتارنے میں
گنوا لیے نقش صورتوں کے نگاہ نقطوں ابھارنے میں
وفا کے سورج نگر سے دل نے کرن سندیسہ نہ کوئی پایا
گزار دیں کتنی چاند راتیں فراق لمحے شمار نے میں

اردو غزل میں مقامی الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں صابر ظفر کی کاوشیں متنوع بھی ہیں اور ہمہ جہت بھی۔اس نوع کی پہلی لائقِ ذکر دستاویز "سانول موڑ مہار" ہے جس میں سرائیکی الفاظ کو عمدہ لسانی شعور کے ساتھ اردو غزل کا حصہ بنایا گیا ہے۔ سرائیکی ثقافت خصوصاً وہ اشعار جو حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی شاعری کی پہچان ہیں،اس مجموعے کی غزلوں میں اپنی تخلیقی آب وتاب کے ساتھ نظر آتے ہیں:

دیکھ لے تاکہ ختم ہو گریہ
آنکھ میں جو اخیری اتھرو ہے
نہ مار نینوں کے تیر ان کی ہے اولڑی پیڑ
نہ دیکھ، جان مری دیدنی اگر ہے بھی

اردو غزل میں کافی رنگ کی جھلک ثروت حسین اور علی اکبر عباس کے ہاں بھی نظر آتی ہے لیکن اس حوالے سے پہلی شعوری، مربوط اور عمدہ کوشش صابر ظفر کی ہے۔اُن کے مجموعہ کلام "عشق میں روگ ہزار" میں غزل اور کافی کی اصناف کو ہم آہنگ کرنے کا تجربہ کیا گیا ہے:

جشنِ وصال کی لاکھ سبیلیں اور سنجوگ ہزار
ایک مجھے بس تو نہیں ملتا، ویسے لوگ ہزار
بھیس بدل کے جو گی والا، گاتا پھرے ظفرؔ
عشق میں روگ ہزار او سائیں عشق میں روگ ہزار

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 39, Issue No. 2, December 2023

غزل میں کافی رنگ پیدا کرنے کے لیے صابر ظفرؔ نے جہاں سندھی اور پنجابی الفاظ سے استفادہ کیا ہے وہاں اُن بحروں کو بھی برتا ہے جو لوک شاعری میں مروّج ہیں۔اس کے علاوہ مقامی لوک داستانوں کے وہ عشقیہ کردار بھی مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں جن کی دکھ بھری آواز کافی کی لوک مقبولیت کا سبب ہے۔ان غزلوں کا لحن بھی عشق مجازی اور عشقِ حقیقی کی ہم آہنگی سے مرتب ہوتا ہے:

نی مائے مجھے باندھ نہ غیر کے پلے
میں رانجھے کی، رانجھا میرے ولے

"سانول موڑ مہاراں" میں صابر ظفر نے جس لسانی تال میل سے کام لیا ہے بقول ڈاکٹر اسلم انصاری "یہ رنگ بہت اِوپرا نہیں معلوم ہوتا۔" اور یہی ایک شاعر کی شعری ظفریابی ہوتی ہے کہ وہ جس رنگ کو تخلیق کرے وہ ماحول میں گھل مل جائے، پھر ان غزلوں میں بقول جمیل جالبی "صوفیانہ ادراک" بھی ہے۔اگرچہ صابر ظفر کے ہاں تصوف کے عناصر کوئی پہلی بار نہیں آئے بلکہ اِس سے قبل مختلف غزلوں میں ایک پورا سلسلہ دِکھائی دیتا ہے۔اِس حوالہ سے اُس کی کتاب "عشق میں روگ ہزار" بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی، جس میں کافی رنگ میں غزلیں کہنے کی ایک مربوط کوشش ہے۔اِن غزلوں کے پس منظر میں اُن کا قیامِ ملتان بھی ہے لیکن صابر ظفر نے جس طرح لوک ثقافتوں سے اپنی وابستگی کا اظہار مسلسل کیا ہے، اُن کا قیامِ ملتان محض ایک جزوی سبب ہے۔یہ غزلیں اُردو غزل میں مقامی عناصر کی جلوہ گری کی ایک کامیاب کوشش تو ہیں ہی اُردو غزل کے مستقبل کے منظرنامے کے لیے بھی جہت نما ہیں:

بلوچ! تیرے سُنیسڑے کی منتظر تھی میں
مگر یہ لوگ کسی اور تھاں سے آئے ہیں

اُردو غزل کو خیبر پختونخواہ کی ثقافت سے ہم آہنگ کرنے کی کوئی مربوط کوشش نہیں ہوئی۔بعض مقامی شعرا کے ہاں پشتو اور سرائیکی کے الفاظ خال خال ضرور آئے ہیں۔اِس سلسلے میں ماضی میں ایک نام قاسم علی خاں آفریدی کا ہے جب کہ جدید دور میں فارغ بخاری، عبداللہ یزدانی اور مقبول عامر کے نام نظرانداز نہیں کیے جاسکے۔یہ نکتہ ضرور پیشِ نظر رہے کہ غزل یہاں کی ثقافت کے لیے قطعی طور پر اجنبی نہیں ہے۔رحمان بابا سے تاحال پشتو،

سرائیکی اور ہندکو کے متعدد شعرا کا وسیلۂ اظہار یہی صنفِ سخن ہے، بلکہ رحمان بابا اور خوشحال خاں کی ایک آدھ غزل تو ایسی ریختہ میں بھی ہے جس میں پشتو اور اُردو کا تال میل ہے۔

صابر ظفر کا مجموعہ کلام "اباسین کے کنارے" اِسی روایت کی قدرے مختلف جہت ہے۔ ایک تو صابر ظفر کے ہاں اِس سے قبل پشتو لفظیات کا استعمال نہیں ہوا۔ دوسرا وہ پنجاب اور سندھ کی ماحول سے مانوس ہے کہ ان دونوں خطوں سے اُس کی سکونت بھی وابستہ ہے لیکن سرحد سے اُس کا ایسا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اِس کے باوجود بھی اُس نے اِس سرزمین کو اپنی تخلیق کا ماخذ بنایا ہے۔

خیبر پختونخواہ کی ثقافت متنوع تہذیبی سیاقتوں کے امتزاج سے تشکیل پاتی ہے۔ لسانی طور پر یہاں اکثریت پشتونوں کی ہے تاہم ہندکو اور سرائیکی بھی یہاں کی بڑی زبانیں ہیں۔ جغرافیائی طور پر صوبہ سرحد پہاڑوں، درّوں، دریاؤں، چشموں اور جھیلوں کی سرزمین ہے۔ مذکورہ مناظر کی کشش اُردو شاعری کی تمثالوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے لیکن صابر ظفر نے اُن کو اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنایا ہے۔ دریاؤں، پہاڑوں اور دیگر جغرافیائی عناصر کا حسن اُس کے ہاں رومانی نظم کے بیانیہ پیراؤں میں نہیں بلکہ غزل کے اشاراتی اور ایمائی اسلوب کے قرینوں کے ساتھ آیا ہے:

ہمیشہ رہتا ہے بالا حصار میں مرا دِل
یہ لوگ چین چرانے کہاں سے آتے ہیں

اِن غزلوں میں شاعر نے خیبر پختونخواہ کا منظر نامہ تشکیل دیتے ہوئے جہاں جغرافیائی عناصر خصوصاً پہاڑوں کی تمثالیں تراشی ہیں، وہاں چشموں اور آبشاروں کی رعایت سے پانی کو ایک بنیادی اِستعارے کے طور پر اختیار کیا ہے۔ یہ اِستعارہ جن اشعار میں استعمال ہوا ہے، اُن میں اِس سرزمین کے حوالہ سے متفرق تجربے معرضِ اظہار میں آئے ہیں۔ بعض رومانی احساسات کا پرتو بھی موجود ہے، وقت کے گزر جانے کا ملال بھی ہے لیکن اِن سب سے بڑھ کر یہاں کی بعض سماجی محرومیوں کی تصویریں نمایاں ہیں۔ صابر ظفر نے پانی کے اِستعارے کے ذریعے تاریخ کے دریچوں میں بھی جھانکا ہے اور عصری صورتِ حال پر بھی توجہ کی ہے۔

"اباسین کے کنارے" شاعر کے تخلیقی عمل میں بہت سی اہلِ فن شخصیات نے بھی سرچشمے کا کام کیا ہے۔ کئی ایک شاعر، مصوّر، اداکار، موسیقار اور گلوکار اُس کی غزل میں اپنے آبدار نقوش دِکھاتے ہیں۔ شاعروں کے ذِکر میں

صابر ظفر نے پشتو،ہند کو اور اُردو کے کلاسیکی شعرا خصوصاً رحمان بابا، خوش حال خاں خٹک،حمزہ خاں شینواری اور سائیں احمد علی کاذِکر بھی نہایت عقیدت سے کیا ہے۔

اُردو اور پشتو کے مابین بعض عناصر ایک عرصہ تک مصنوعی مغائرت پیدا کرتے رہے، حالانکہ فارسی کے رِشتے سے یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور اب تو ایک عرصہ ہوا ایک ہی جغرافیے میں نشوونما بھی پارہی ہیں۔ یہاں تراجم کی اُس روایت کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے، جو حمزہ شنواری سے لے کر طٰہٰ خان تک نظر آتی ہے، جس سے یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے اور قریب ہوئی ہیں۔ پشتونوں نے اُردو کے لیے کیا کیا خدمات انجام دیں،اِس سلسلے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی سے لے کر حنیف خلیل تک کی تالیفی کاوشیں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

"اباسین کے کنارے" میں صابر ظفر کو اُردو غزل میں پشتو لفظیات برتتے ہوئے یقینا قاسم علی خاں آفریدی طرح کوئی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا ہو گا۔اِن لفظوں کو استعمال کرتے ہوئے اُس نے بطورِ خاص پشتو تہذیب و ثقافت پر بھی توجہ کی ہے، پشتون لباس، زیورات اور آلاتِ موسیقی کو اُس نے اُردو غزل کا حصہ بناتے ہوئے تخلیقی رویہ اختیار کیا ہے اور بعض شعری رعایتوں کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے تہذیبی عناصر کی معنویت کی طرف رجوع کیا ہے۔

بہت حسین ہے "نگرہ" تو خوش نما "پرتوگ"
مگر وجود کی شکنیں لیے کدھر جائیں

تہذیبی عناصر کے سلسلے میں ادبی لحاظ سے پشتو کی ادبی اصناف اور لوک داستانوں کے کرداروں میں صابر ظفر کی ایک خاص کشش بھی اِن غزلوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ادبی اصناف کا اُس نے محض ذِکر ہی نہیں کیا بلکہ بعض ادب پاروں کی تخیئلی لہر سے بھی اِستفادہ کیا ہے اور انھیں غزل کے شعر کے پیکر میں ڈھال کر ایک منظوم ترجمے کی صورت پیدا کی ہے۔لوک داستانوں کے سلسلے میں "آدم خان درخانئ"، "بہرام و گل اندام"، "شیر عالم مامونئ"، "یوسف خاں شہر بانو" کے کردار اپنے رومانی اوصاف کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

صابر ظفر نے تہذیبی عناصر کے مذکورہ پیرایۂ بیان اور ایک شعر جس میں ڈیرہ کے سوہن حلوے کی شیرینی کو بوسۂ لب سے تعبیر کیا ہے سے قطع نظر ان کو عصری حالات کے تناظر میں بھی دیکھا ہے۔ یہ خطہ گزشتہ چند دہائیوں سے بالعموم اور کچھ برسوں سے بالخصوص جن حالات کا سامنا کر رہا ہے۔ اُس کے بھیانک اثرات وسیع تر ہیں۔ اِن حالات کا ذمہ دار کون ہے؟ یہاں اِس سے بحث نہیں ویسے بھی جنگوں اور فسادات کے اسباب کم و بیش ایک جیسے رہے ہیں اور اِن کے مابعد اثرات بھی تاریخِ انسانی میں مختلف نہیں لیکن صابر ظفر نے اِن حالات کے باعث تہذیب کی معدومیت کے دراز تر سلسلے پر ضرور ماتم کیا ہے:

خون میں ڈوبی ہوئی بنوں کی مہندی دیکھی
موت بارات میں تھی ، ہر کوئی دِل گیر ہوا

چاہا جہاں "دریس" میں بے خود ہو زندگی
حالات نے وہاں کوئی رقصِ فنا کیا

"اباسین کے کنارے" اُردو زبان کی وسعت کے لیے ایک اہم تخلیقی کام اور اُردو غزل کو حقیقی معنوں میں پاکستان کا تہذیبی ورثہ بنانے کی قابلِ تحسین کوشش ہے۔ اُردو زبان پر عربی و فارسی کے احسانات سے کسے انکار ہے لیکن عصری جغرافیائی حقائق کی روشنی میں یہ ایک بڑی ضرورت ہے کہ اِس خطے کی علاقائی زبانوں کے چشموں، جن سے اُردو ماضی میں بھی پیاس بجھاتی رہی ہے اور شعرا نے اُن لفظوں کے ذریعے اپنی تخلیقی زمینوں کی زرخیزیوں میں اضافہ ہی کیا ہے، کی طرف ایک بار پھر رجوع کرنا چاہیے ،اِس تناظر میں آج اہلِ قلم کو زبان کی اُس ساخت پر ضرور غور کرنا چاہیے جو بعض جبری رویوں کے باعث تشکیل پائی۔

اردو غزل میں مقامی الفاظ اور ثقافت کے سلسلے میں صابر ظفر کا سب سے منفرد کام قصہ ہر ریانجھا کو نظم کرنے کا ہے۔ غزل کے اندر کسی واقعہ یا کہانی کو ظلم کرنے کا رجحان بھی خال خال رہا ہے لیکن کسی تعلیم داستان کو ایک ہی طویل غزل میں بیان کرنے کی حوصلہ مندی صرف صابر ظفر نے دکھائی ہے۔ رانجھا تخت ہزارے کا(2013ء) طویل غزل ہے جس میں صابر ظفر نے پنجاب کی لوک داستان ہیر رانجھا کو نظم کیا ہے۔408اشعار پر مشتمل یہ غزل

اپنے اندر حیران کن تجربات کو سمیٹے ہوئے ہے۔اس غزل کے اندر شعری قرینوں کا بغور جائزہ لیں تو نہ صرف میرائے قرین حقیقت معلوم ہوتی ہے بلکہ حیرت افزا مسرت ہوتی ہے۔ صابر ظفر نے اردو غزل میں جس قدر تجربے کیے ہیں،ان میں سب سے مشکل اور حوصلہ طلب کام 'رانجھا تخت ہزارے کا' ہے۔اس غزل کی بحر کم و بیش وہی ہے جو وارث شاہ نے پنجابی میں ہی رقم کرنے کے لیے اختیار کی۔اردو شاعری میں اس بحر کا رواج نہیں ہے بلکہ اردو میں رائج عروضی نظام کے دائرے سے قدرے انحراف ہے۔

رانجھا تخت ہزارے کا ہیر رانجھے کی داستان کے بیانیہ اظہار کے پیرائے میں ہے اور اس داستان کو اس کے جملہ واقعات کے تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اس طویل غزل میں کرداروں کے جذبات،احساسات اور کیفیات کے اظہار کے لیے شاعر نے جو تشبیہاتی نظام تشکیل دیا ہے،اس میں لوک روایت اور داستانوں کی مخصوص فضا کا بطور خاص لحاظ رکھا ہے۔یہاں چند تشبیہات کا ذکر ناگزیر ہے:

رہتا تھا بجھارانجھڑا ایسے اکثر، پانی ختم ہو جس طرح حقے اندر

گال نرم ہیں سسلی کے سیب جیسے، جیسے، شعلے کی شکل میں لپکے اندر

جیسے خوف سے بھاگتی بکریوں کو، چیر پھاڑ دے شیرنی غصے اندر

ایسے تیزی سے بھاگ کے ہیر لپکی پھرتی جس طرح ہوتی ہے شکرے اندر

تیرِ ہجر سے ایسے ہے جسم چھلنی، نیزے لگتے ہیں جیسے مشکیزے اندر

"رانجھا تخت ہزارے کا" غزل کے رچاؤ اور داستان کے رس کا امتزاج ہے۔ بعض اشعار اپنی اکائی میں بھی مفہوم دیتے ہیں جب کہ بعض کے معنی اشعار کے تسلسل سے ہی کھلتے ہیں۔اس طویل غزل میں رعایت لفظی کا اہتمام بھی توجہ اور تحسین چاہتا ہے۔یہ غزل ایک تفصیلی جائزے کا تقاضا کرتی ہے اور پنجاب کی داستانوں کے پارکھوں اور ان

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 39, Issue No. 2, December 2023

کے محسنات قصہ و محاسن شعری پر لکھنے والوں کی اس اہم تخلیقی کارنامے پر توجہ کی ضرورت ہے۔ذیل میں اس طویل غزل سے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر اپنے ہنر کی بھٹی سے کس حدت کا سامنا کر کے گزرا ہے۔

ہیر کہتی ہے ڈھونڈ کے لاؤ اس کو تم جہاں کہیں گھومتا پاؤ اس کو
سکھیاں جاتی ہیں، کہتی ہیں راکھوے سے کھٹی میٹھی ہے ہیر پشمینے اندر
رانجھا کہتا ہے ملا سے، چٹھی لکھ دے، میری کیفیت، دیکھ کے ساری لکھ دے
سوئی کر گئی تو مرے دل کی بستی، اور جا بسی گاؤں بیگانے اندر
آئی ہونٹوں پر میرے کب کوئی سسکی تو تو چپکے سے غیر کے ساتھ کھسکی
کب ہے عشق کا راستا سہل اتنا دینا پڑتی ہے جان یارانے اندر

دیگر خطوں کی طرح جدید اردو غزل بلوچی زبان و ثقافت کی خوشبو سے بھی آشنا ہوئی ہے۔یہ مہک عطا شاد کی غزلوں کے متن ہی میں نہیں بلکہ ان کے مجموعہ کلام "سنگاب" کے عنوان میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ تنگیں (پیاسا)، تلکیں (دام)، زباد (بادِ جنوب)، گلگ (بال)، واجہ (صاحب/دولہا) ایسے الفاظ کا استعمال ان کے ہاں ایک خاص تخلیقی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہوا ہے۔عطا شاد نے "یہ الفاظ اس طرح اردوائے ہیں کہ اجنبی ہونے کے باوجود یہ الفاظ مانوس لگتے ہیں اور طبیعت پر گراں گزرتے ہیں نہ ہی شعر کے آہنگ کو متاثر کرتے ہیں۔"(9)

میری باتوں میں ایک ڈر واجہ!
تم نے رکھا ہے جان کر واجہ!
کیسے دے دوں اسے اجازت میں
رہن رکھے وہ میرا گھر واجہ!

جنم جنم کی پیاس بجھائے ، ایک سلگتی آس ،دل
سیلاب طلب بولان ہو جیسے

برق گرے، یا شعلے برسیں، پھر بھی رہے شاداب
میں تشنہ کشت طرب بولان ہو جیسے
زلزلہ در داماں ہے لیکن خاک بسر ہے ، چاک
گریباں ، زخم غم احساس سے چور
صدیوں کا محروم، ہزاروں عمروں کا ناکام وہ اک
انسان کہ اب بولان ہو جیسے
بچھڑے ہوئے ساتھی نہ ملے پھر، آتے جاتے موسم
بھی ناکام رہے ، پر جانے کیوں؟
دل کی راہ گزر ہے سونی، آس تھکی ہے، وہ عالم ہے
جان بلب بولان ہو جیسے

جدید اردو غزل میں بلوچی زبان و ثقافت کا یہ تخلیقی تسلسل بعض دیگر شعرا کے اسلوب میں بھی اپنی لسانی جمالیات کے ساتھ مستعمل نظر آتا ہے:

دامن کوہستاں میں
سلسلے گدانوں کے
دلفریب نظارے
سُرمئی چٹانوں کے
(عصمت درانی)

بُوئے سنجد کو طلسماتی فضائیں ترسیں
شال کی دید کو بے چین نگاہیں ترسیں
(افشیں بلوچ)

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 39, Issue No. 2, December 2023

آج پھر یاد نے کروٹ لی ہے
آج پھر کیچ کی مہمیز ہواؤں نے چُھوا
آج پھر یاد وطن دل کو ستانے آئی
آج پھر تشنہ زھیری نے جگر تھام لیا
(عظمیٰ قادری)

جانے کس تربت میں کس مکران میں ہو شہ مرید
تجھ کو در در ڈھونڈتی پھرتی رہی حانی یہاں
(قندیل بدر)

اڑ رہی ہے دھول کتنی کیوں فضا رنجور ہے
چلتن و بولاں میں پھونکا آج کس نے صور ہے
(قندیل بدر)

جدید غزل میں مقامی الفاظ اور ثقافتوں کی جلوہ گری کے مذکورہ مظاہر اسی حقیقت کا ادراک فراہم کرتے ہیں کہ شاعری کی زبان اپنے باطن میں کسی نوع کی رکاوٹ نہیں رکھتی۔ لفظ کا تخلیقی استعمال اسی کا جواز فراہم کرتا ہے۔

اردو زبان ان خطوں کی قومی زبان قرار پائی جاتی ہے جن میں مقامی سطح پر متنوع ثقافتیں ہیں لیکن وہ نہ تو ایک دوسرے کے لیے اجنبیت رکھتی ہیں نہ ہی اس جامع تہذیب سے جس میں اردو زبان کا اکھوا پھوٹتا ہے لیکن غزل میں مقامی ثقافتوں کی جلوہ گری دیکھی جائے تو شعرا کے ہاں کچھ زیادہ فراخ دلی کے مظاہر دکھائی نہیں دیتے۔ عددی سطح پر بھی شعرا کی کاوشیں محدود ہیں اور تخلیقی طور پر بہت زیادہ وسعت نظر نہیں آتی۔ جن شعرا نے اردو غزل میں کچھ ایسی کاوشیں کیں وہ باوجودیکہ مستحسن نہیں، زیادہ رواج نہیں پا سکیں اور دیگر معاصر شعرا کے ہاں ان کی قبولیت کے سلسلے میں ایک جھجک اور تنقیدی مضامین قدرے تشکیک و تضحیک کے پہلو بھی سامنے آئے۔

اردو غزل میں اسلوب اور زبان کی سطح پر متنوع تجربات ہوئے ایسا نہیں ہے کہ اردو غزل میں بہت زیادہ روایت پسندی رہی لیکن لسانی اجتہاد کے سلسلے میں شعرا کی جانب سے پذیرائی کا پہلو زیادہ توانا نظر نہیں آتا۔ غزل

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 39, Issue No. 2, December 2023

ہماری تہذیب کی امین رہی ہے لیکن تہذیب کے سلسلے میں ہمارے تصور تاحال عرب و عجم سے کم ہی باہر آیا ہے اور اس میں مقامی ثقافتوں کا رچاؤ محدود پیمانے پر نظر آتا ہے۔ اردو غزل میں شعرا نے مقامی الفاظ اور ثقافت کو سمونے کی جو خوبصورت کاوشیں کی ہیں ان کا اسلوب اور پیرایہ اظہار یہ ثابت کرتا ہے کہ اردو اور مقامی زبانوں میں غیریت کم سے کم اور تخلیقی ربط بہت زیادہ ہے لیکن تاحال ان دیواروں کو منہدم نہیں کیا جا سکا جو ماضی میں غیر محسوس طریقے سے تعمیر ہوئیں اور ایک خاص تصورِ تہذیب کے تحت بلند ہوتی گئیں۔

حوالہ جات

1۔ اشفاق احمد، اردو کے خوابیدہ الفاظ، (لاہور: مرکزی اردو بورڈ، 1972ء)، ص الف
2۔ جمیل جالبی، قدیم اردو لغت، (لاہور: اردو سائنس بورڈ، 2008ء)، ص 4
3۔ ریاض قدیر، قدیم اردو اور پنجابی کے لسانی روابط، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 2017ء)، ص پس ورق
4۔ خیال بخاری، دیوان قاسم علی خان آفریدی (اردو)، (پشاور: پشتو اکیڈمی، 1971ء)، مرتبہ، ص 115
5۔ مجید امجد، دیباچہ: سانولے من بھانولے، مشمولہ: کلیات شیر افضل جعفری، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، 2022ء)، مرتبہ: نجم الحسن خان، ص 135
6۔ مالک رام، صوری تبسم کی شاعری، مشمولہ: تحریر، (دِلّی، اپریل جون 1978ء)، ص 103
7۔ وزیر آغا، بحوالہ: معاصر (2)، (لاہور: اکتوبر 1979ء)، ص 736
8۔ احمد ندیم قاسمی، خواب دریچہ (مجموعہ کلام جلیل عالی)، (لاہور: امپرنٹ، 1985ء)، ص 11
9۔ فیصل احمد، بلوچستان کا ادبی تناظر، (کوئٹہ: مہر در انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز، 2014ء)، ص 27